"اچھا دیکھتے ہیں۔"

زبیدہ کو ایسے خشک ردِ عمل کی بالکل توقع نہیں تھی۔

"غور سے پڑھا بھی ہے۔ بے پروائی سے کہہ دیا کہ دیکھتے ہیں۔ کیا دیکھو گے۔ اتنی لمبی رقم کا انتظام پندرہ دن میں کہاں سے ہو جائے گا۔ میں پہلے ہی کہتی تھی کہ دیکھو قسطیں مہینے کے مہینے ادا کرتے رہو نہیں تو بہت سود چڑھ جائے گا۔ مگر تم نے میری ایک نہ سنی۔"

"زبیدہ تمہیں پتہ ہے کہ مہینے پر کتنی قسطیں ادا کرنی پڑتی ہیں۔ جس قسط کو روکتا اسی کی طرف سے نوٹس آجاتا تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی کی قسط تو رکنی ہی تھی۔"

"کیوں رکنی تھی۔"

"جہاں جہاں سے ہم نے مکان کے لئے قرض لیا تھا ان سب کی قسطیں باقاعدگی سے ادا کی جاتیں تو ہم کھاتے کیا۔ گھر کے خرچ کے لئے کوڑی نہیں بچنی تھی۔"

"نہ کھاتے فاقے کر لیتے۔"

اس پہ مجھے یاد آیا کہ جب مکان کی تعمیر کے دوران قرضے پہ قرضہ لیا جا رہا تھا اور اس پر میں نے فکر مندی کا اظہار کیا تھا تو زبیدہ نے اسی قسم کا اعلان بڑے اعتماد سے کیا تھا کہ اپنا گھر بن جانا چاہیے، سب قرضے ادا ہو جائیں گے، اپنا گھر ہو تو آدمی فاقے بھی کر سکتا ہے۔ نہیں کھائیں گے، تر نوالہ، روکھی سوکھا کھا کے سب قرضے اتار دیں گے۔ مگر مکان بن جانے کے بعد زبیدہ نے اس اعلان کو کہاں یاد رکھا۔ گھر کے اخراجات اسی طرح جاری رہے بلکہ نئے مکان کی فرنشنگ کے چکر میں اخراجات کچھ بڑھ ہی گئے۔ اور میں قرضوں میں جکڑا ہوا تھا۔ ہر قرضے کی شرط یہ تھی کہ قسط ماہانہ ادا کی جائے۔ میں پریشان کہ یا اللہ کونسی قسط ادا کروں کونسی ادا نہ کروں۔ جس قسط سے ذرا ہاتھ کھینچا اس قسط کے سلسلہ میں یاد دہانی کا پروانہ موصول ہو گیا۔

اصل میں اپنے گھر کے بنی مون کی مدت بہت مختصر رہی۔ ابتدا کے دن تو خوشی خوشی

گذر گئے۔ خوشی سی خوشی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ اپنے بنائے ہوئے گھر میں بسر کرنے کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ کتنا اطمینان، کتنی آسودگی ہوتی ہے اپنی ڈالی ہوئی چھت تلے سونے جاگنے میں۔ مگر جب قسطوں کی ادائیگی کا مرحلہ آیا اور یاد دہانیوں کے پروانے آنے شروع ہوئے تو پھر تصویر کا دوسرا رُخ سامنے آیا۔ بوجان نے تو مجھے بس یہ تصویر دکھائی تھی کہ آدمی کا اپنا کونہ نہ ہو تو بے ٹھکانا رہتا ہے۔ ساری مزاحمت کے باوجود یہ خیال میرے اندر سرایت کر گیا۔ لگنے لگا کہ میں اسی باعث اکھڑا بکھرا پھرتا ہوں کہ اپنا کوئی ٹھیا نہیں ہے۔ اگر اپنا مکان بنا لوں تو زندگی میں ایک جماؤ آجائے گا۔ مگر مکان بنانے کے تھوڑے ہی دن بعد کھلا کہ میں تو اور بکھر گیا ہوں۔ ہاؤسنگ فنانس کارپوریشن میں، بنکوں میں، اپنے دفتر کے اکاؤنٹ سیکشن میں ــــ کہاں کہاں بکھرا پڑا ہوں۔ شاید یہ اس نئے زمانے کی زندگی کا خاصہ ہے کہ آدمی جتنا اطمینان کے لئے جتن کرتا ہے اتنا ہی اپنی پریشانیوں میں اضافہ کرتا ہے، آسائش کے جتنے اسباب مہیا کرتا ہے اتنا ہی بے آرامی کا سامان کرتا ہے جتنا زندگی میں ترتیب کا اہتمام کرتا ہے اتنا ہی بکھرتا چلا جاتا ہے اور اپنا مکان، یہ تو بور کے لڈو ہیں کہ کھائے تو پچھتائے نہ کھائے تو پچھتائے۔ بہرحال اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس پچھتاوے سے تو اپنی وہ حسرتِ تعمیر ہی اچھی تھی۔

"خیر اس وقت تو جی جلانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے" میں نے قصہ مختصر کرنے کی کوشش کی "صبح دفتر نہیں جاؤں گا۔ اسی بارے نکلوں گا۔ کچھ نہ کچھ بندوبست ہو ہی جائے گا۔"

"اگر تم ایسے ہی بندوبست کرنے والے ہوتے تو پہلے نہ کر لیتے۔ آج کہہ رہے ہو کہ کل کچھ کروں گا۔ کل کہو گے کہ پرسوں کروں گا۔ بس اسی آج کل میں میعاد گذر جائے گی اور وہ کمبختی مارے ہمارے گھر کی بولی لگانے کے لئے آن دھمکیں گے۔"

بوجان کہ اب تک خاموش بیٹھی تھیں تڑپ کر بولیں "خاک بھبھل ان منہ جھلسوں

کے منہ میں آئے بڑے کہیں کے ہمارے گھر کی بولی لگانے والے۔

"اچھا صبح تو ہونے دو۔ کل دیکھیں گے۔" میں نے ایک مرتبہ پھر قصہ مختصر کرنے کی کوشش کی۔

"جب میں نے کہا تھا کہ ایک من چاول کا بندوبست کر دو، اچھے بُرے وقت کیلئے گھر میں پڑے رہیں گے تو اس وقت بھی تم نے یہی کہا تھا کہ اچھا کل کچھ کریں گے۔"

"ایک من چاول" بوجان بولیں۔ "ایک من چاول میں دلہن تم کتنے دن نکال لوگی شیطان کے کان بہرے، اگر دنگا فساد شروع ہوا تو جلدی تو نہیں نبٹ جائے گا۔

"ایک من چاول۔ اے دلہن خالی ایک من چاول سے کیا بنے گا۔ بازار تو سارے پٹ ہو جائیں گے۔ کوئی چیز نہیں ملے گی۔"

"بوجان آٹا تو بھرا رکھا ہے اور منگا کے رکھ لوں گی۔ دالیں بھی بھری رکھی ہیں۔"

"اری وہ تو مہینے کے خرچ کی ہوں گی۔ اس وقت گوشت تو ملے ولے گا نہیں، دالوں پہ ہی گذارہ ہوگا۔

"سب دالیں منگا کے رکھ لو۔ نون مرچ، دھنیا، لہسن پیاز ہر چیز وقت کا کوئی پتہ تھوڑا ہی ہے۔"

میں نے بوجان اور زبیدہ کی یہ گفتگو حیرت سے سنی۔ لگتا تھا کہ ساس بہو میں سنجیدگی سے کچھ بڑے مسائل پر تبادلہ خیال ہوا ہے اور بعض انتظامی امور طے ہوئے ہیں اور یہ کہ مجھے اعتماد میں لینے کی قطعی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

"قصہ کیا ہے۔ کیا جنگ چھڑنے والی ہے؟"

"سن رہی ہو بوجان، تمہارے بیٹے کیا پوچھ رہے ہیں۔" زبیدہ کا لہجہ سخت طنزیہ تھا۔

"میرے لال، دنیا میں رہتے ہو تو دنیا کی خبر بھی رکھا کرو۔ تم تو باہر گھومنے

پھرنے والے ہو، تمہیں تو زیادہ پتہ ہونا چاہیے۔ ہم گھر میں بیٹھے اتنا کچھ سن رہے ہیں۔ نصیبن بوا بتا رہی تھی کہ دونوں طرف جھڑپیں تیز ہو رہی ہیں۔ وہ قتلام ہوگا کہ خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔"

"اچھا؟" بوجان کی باتوں سے میں محظوظ ہونے کے موڈ میں تھا۔

زبیدہ نے پھر نشتر چلایا۔ "بوجان اپنے بیٹے کا جواب سن لیا۔ بھولے بن کر پوچھ رہے ہیں کہ اچھا۔ ان کی انہیں باتوں پہ تو میرا جی جلتا ہے۔"

"بیٹے، میرے چاند، تم کس مراق میں رہتے ہو۔ چاروں طرف شور مچا ہوا ہے۔ تمہیں کسی بات کی کوئی خبر ہی نہیں ہے۔"

"بس انہیں اتنا ہی پتہ ہوتا ہے جتنا کامریڈ انہیں بتا جاتا ہے۔"

"مگر بخت مارے کامریڈ کو تو دنیا کی ہر بات کا پتہ ہوتا ہے۔ اسے اور کام ہی کیا ہے۔ جو رونہ جاتا گھر نہ بار۔ ٹک کے کہاں بیٹھے۔ جلے پاؤں کی بلی بنا گھومتا ہی رہتا ہے۔"

"جب ہی تو لوگ اس پہ انگلیاں اٹھاتے ہیں۔" زبیدہ کہنے لگی۔ "نصیبن بوا مجھ سے پوچھنے لگی کہ یہ آدمی تمہارے گھر کیوں آتا ہے۔ میں نے کہا کیوں بات ہے۔ کہنے لگی کہ یہ تو روس کا جاسوس ہے۔ بوجان یہ سن کے ایک دفعہ تو میں سناٹے میں آگئی۔"

"اجی کوئی روس کا جاسوس ہے تو ہوا کرے، ہمیں کیا ہم کونسا روس کے خلاف مسکوٹیں کرتے ہیں۔ پھر بھی اگر کوئی لگائی بجھائی کرتا ہے تو کرے، ہماری جوتی سے روس سے۔ ہمارا کونسا لینا دینا ہے۔ جو وہ ہمیں دیتا ہو وہ نہ دے۔"

میں نے دیکھا کہ بات قسطوں کی ادائیگی کے مسئلہ سے چل کر روس پر پہنچ گئی ہے۔ میں نے یہ موقعہ غنیمت جانا۔ اب زبیدہ کی طرف سے کسی نشتر کا اندیشہ نہیں تھا۔ ادھر ادھر کی بات کر کے قصہ مختصر کیا اور بوجان کو احساس دلایا کہ ان کے دعا پڑھنے

اور سونے کا وقت آن پہنچا ہے۔ بوجان فوراً ہی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ ادھر میں نے بھی اعلان کر دیا کہ بہت تھکا ہوا ہوں بس سونا چاہتا ہوں۔

زبیدہ نے صبح ہی جھنجھوڑ کر اُٹھا دیا۔ وہ دن تو اب گذر گئے تھے جب اس گھر میں ترڑکے سے میری آنکھ کھل جاتی تھی اور پھر میں اس گھر میں چڑھنے والی تازہ تازہ صبح کا لطف اُٹھاتا تھا۔ دیر سے اُٹھنے کا معمول واپس آگیا تھا۔ وہی پرانا دستور کہ زبیدہ نے جھنجھوڑا "اجی آج تمہیں دفتر جانا نہیں ہے" خیر یہ جملہ تو بہت پُرانا ہو گیا تھا۔ نئے گھر میں آکر جگانے کے کچھ نئے بہانے پیدا ہو گئے تھے "کچھ یاد ہے آج آپ کو قسط جمع کرنی ہے"

"اُٹھئے نا۔ آج بنک بھی جانا ہے۔ پراپرٹی ٹیکس جمع کرانے کی آج آخری تاریخ ہے" ویسے آج زبیدہ نے اس قسم کا کوئی نوٹس نہیں دیا۔ بس جھنجھوڑ کر اُٹھا دیا۔ شاید مزاج کی درہمی کسی قدر ابھی باقی تھی۔

میں اُٹھ کر باتھ روم گیا۔ نہایا دھویا۔ برآمدے میں آبیٹھا۔ فوراً ہی سامنے ناشتہ آگیا۔ ناشتہ کے آتے ہی صبح کے مہمان بھی ایک ایک کر کے آن موجود ہوئے اور مجھے لگا کہ جیسے میں نئے سرے سے اکٹھا ہو رہا ہوں۔ رات تو زبیدہ کی باتیں سُن کر بالکل ہی بکھر گیا تھا۔ ایک مجذوب کے متعلق سن رکھا تھا کہ رات کو سوتے وقت ان کے اعضا بکھر جاتے تھے، صبح ہوتے پر اعضا یکجا ہوتے اور بزرگ صحیح وسالم اُٹھ کھڑے ہوتے۔ مگر میرے اعضا دن نکلنے کے ساتھ بکھرنے شروع ہوتے۔ بس ادھر گھر سے قدم نکالا اور اعضا بکھرنے شروع ہوئے۔

ہاں تو میں اپنے صبح کے مہمانوں کا ذکر کر رہا تھا۔ یہ بھی بتانا پڑے گا کہ ان مہمانوں کی آمد کی تقریب کیسے پیدا ہوئی برآمدے کے سامنے اپنے مختصر سے سبزہ زار میں جو ہار سنگھار لگایا تھا وہ اب اچھا خاصا بڑا ہو گیا تھا۔ اس کے قریب انار۔ انار کے قریب

لگروندا۔ یہ چراغ حویلی کی طرح کوئی لمبے چوڑے احاطہ والا گھر تو تھا نہیں کہ نیم اور املی جیسے اونچے پیڑ لگائے جا سکتے۔ یہاں تو چھوٹے قد اور کم پھیلنے والے درخت ہی لگائے جا سکتے تھے۔ سوہار سنگھار، انار، لگروندا۔ ساتھ میں چند پودے اور بیلیں۔ یہی بیلا، چنبیلی، موتیا، گلاب ان میں کسی کی بیل کسی کا پودا۔

ان پیڑ پودوں کی وجہ سے اپنا یہ چھوٹا سا گھر جلد ہی شاد آباد ہو گیا۔ کیا کیا مہمان یہاں آ کر اترا تھا۔ یہ جو خاکستری رنگ کی چڑیاں ہوتی ہیں ان کا کیا ہے جہاں نام کو بھی دانا دنکا دیکھا، آن اکٹھی ہوئیں۔ ہر گھر میں اپنے لئے جگہ پیدا کر لیتی ہیں۔ کڑیوں والے مکانوں میں انہیں اپنے گھر بنانے کی زیادہ سہولتیں حاصل تھیں۔ ذرا کڑی جھکی اور انہوں نے چار تنکے چن کر اپنا گھونسلہ بنا لیا۔ چھتیں کڑیوں سے بے نیاز ہوئیں تو پھر ان کی ساری توجہ روشندانوں پر ہو گئی۔ گھر میں جب گھونسلہ بنا لیا تو پھر گھر کے کھانے پینے میں بھی برابر کی شریک ہو گئیں۔ خیر ابھی اپنے گھر کا کوئی گوشہ ان کے گھونسلوں کی زد میں نہیں تھا۔ مگر صبح کے ناشتہ میں شریک ہونا ان کی عادت بنتی جا رہی تھی۔ شاید بن چکی تھی۔ سیدھی وجہ یہ تھی کہ جب سے میں یہاں منتقل ہوا تھا، کمرے میں بند ہو کر ناشتہ کرنے کا طریقہ میں نے ترک کر دیا تھا۔

برآمدے میں بیٹھ کر ناشتہ کرتا تھا۔ مجھے تو پتہ بھی نہیں چلا کہ اس نیک رسم کا آغاز کیسے ہوا۔ بس مجھے رفتہ رفتہ اس کا احساس ہوا کہ جب میں صبح ہی صبح برآمدے میں بیٹھ کر ناشتہ کرتا ہوں تو آس پاس کچھ چڑیاں بے چین بے چین سی نظر آتی ہیں۔ کوئی کوئی بے تاب ہو کر میز پر آن بیٹھتی ہے اور پلیٹ میں رکھے توس کو ندیدے دیدوں سے دیکھتی ہے۔ یہ دیکھ میں نے کھلے دل سے ان چڑیوں کا خیر مقدم کیا اور اپنے ناشتہ میں انہیں مستقل شریک بنا لیا۔ توس کے کنارے ریزہ ریزہ کر کے ڈال دیتا۔ وہ بڑے شوق سے ان ریزوں کو چگتیں اور دم بھر میں چٹ کر جاتیں۔ اس

روز روز کی خاطر داری سے ان کی بے تکلفی اتنی بڑھ گئی کہ کوئی کوئی اڑ کر ناشتہ کی میز پر آن بیٹھتی۔ تھوڑی دیر دور دور پھدکتی۔ پھر ایک دم سے قریب آکر میرے سامنے رکھے توس پر چونچ مارتی۔ چڑیوں کی اس بے تکلفی پر اعتراض نہیں۔ اعتراض اس بات پر ہے کہ اتنے قرب اتنی بے تکلفی کے بعد بھی چڑیاں آدمی پر اعتبار نہیں کرتیں۔ بہت وہمی اور شکی ہوتی ہیں۔ اعتبار کر کے بھی اعتبار نہیں کرتیں۔ ذرا کھٹکا ہوا اور پھر اکھا کر اڑ گئیں۔ کوے کا معاملہ تو یہ ہے کہ وہ تو سرے سے اعتبار کرتا ہی نہیں۔ مریضانہ حد تک شکی۔ ہر وقت کان کھڑے رکھنا سمجھتا ہے کہ ساری دنیا اس کے درپئے آزار ہے۔ روٹی کا ٹکڑا ڈالو، فوراً آئے گا۔ مگر ٹکڑا ڈالنے والے پر اعتبار کر لے یہ نہیں ہو سکتا۔ تو کوے نے تو اعتبار کرنا سیکھا ہی نہیں۔ اس لئے اس کی کسی حرکت سے صدمہ بھی نہیں ہوتا۔ مگر چڑیاں تو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ انہیں آپ پر بہت اعتبار ہے اور پھر اچانک کسی ذرا سی بے معنی سی بات پر اپنی بے اعتباری کا اعلان کر دیتی ہیں۔ میں سمجھتا رہا کہ میں نے ان کا بہت اعتبار حاصل کر لیا ہے۔ مگر کبھی زور سے کھانس دیا یا چھینک آ گئی تو آن کی آن میں انہوں نے سارے آپس کے اعتبار کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا۔ بھر اکھا کر یہ جا وہ جا جا ہے وہ اس کے بعد فوراً ہی واپس آجائیں مگر ایک مرتبہ تو ظاہر کر ہی دیا کہ انہوں نے مجھ پہ کچھ زیادہ اعتبار نہیں کیا تھا۔

خیر چڑیاں اعتبار کریں یا نہ کریں۔ مگر تکلف نہیں کرتیں۔ کھانے پینے کے معاملہ میں بہت ہی بے تکلف واقع ہوئی ہیں۔ تو صبح کے ناشتہ پر وہ بہت بے تکلفی سے میرے قریب آجاتیں.... مگر بلبل کے یہاں تکلف بہت ہے۔ میں توس کے کنارے ریزہ ریزہ کر کے قریب ہی ڈال دیتا۔ چڑیاں بے تکلف اتر آتیں اور چگ لیتیں۔ ایک دن دیکھا کہ ایک بلبل آس پاس منڈلا رہی ہے۔ قریب آنے سے جھجکتی ہے۔ میں نے اس کی جھجک کا احترام کرتے ہوئے توس کے تھوڑے ریزے سامنے والے

ہار سنگھار تلے بکھیر دیئے اور خود واپس آکر برآمدے میں اپنی جگہ آن بیٹھا۔ بلبل کسی قدر تامل کے بعد انار کی شاخ سے اُڑ کر ہار سنگھار پر آئی۔ پھر جھجکتی جھجکتی شاخ سے اُتر اور ایک ریزہ چونچ میں داب پھرتی سے اُڑ پھر شاخ پہ جا بیٹھی۔ پھر اُس نے مجھ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ میری حرکات و سکنات کا جائزہ لیا۔ پوری طرح اطمینان کر لینے کے بعد پھر شاخ سے اُتری۔ پھر ایک ریزہ چونچ میں دبا اور پھر اسی پھرتی سے شاخ پہ جا بیٹھی۔ خیر یہ تکلف پہلے دن رہا۔ کسی قدر دوسرے دن۔ تیسرے دن اس نے شاخ سے اُتر کر اطمینان سے ریزے چن چن کر کھائے۔ چوتھے دن وہ اکیلی نہیں آئی۔ زیادہ ساتھ آئے اور پھر وہ اس دسترخوان پر چڑیوں کے مستقل شریک ہو گئے۔ بلبلوں کی شرکت نے ہار سنگھار کی چھاؤں میں بچھنے والے اس دسترخوان کو چار چاند لگا دیئے۔

چند دنوں بعد دیکھا کہ دو گرسلیں بھی بروقت آن اُترتی ہیں اور چڑیوں بلبلوں کی شریک بن جاتی ہیں۔ ان کی شرکت بھی بھلی لگی۔ لیکن جب ایک کوّے نے یہاں آکر اس سبھا میں کھنڈت ڈالی اور ان کے رزق پر ہاتھ صاف کیا تو مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی۔ اور وہ تو ان ریزوں پر اتنا ٹوٹ کر گرتا تھا اور اتنا جارحانہ رویہ اختیار کرتا تھا کہ چڑیا بلبلیں گرسلیں سب تھوڑی دیر کے لئے کنارہ کش ہو جاتیں۔ کتنی مرتبہ میں نے اسے اُڑانے کی کوشش کی، دھتکارا، شی شی کیا، مگر کوا تو بہت ڈھیٹ ہوتا ہے۔ مگر پھر مجھے خیال آیا کہ کوّے کے خلاف میرے یہاں اتنا تعصب کیوں ہے۔ آخر یہ بھی تو پرندہ ہے اور وہ پرندہ ہے جسے گیتوں کی برہمن کاگا کہہ کر پکارتی ہے۔ نام سے بھی کتنا فرق پڑ جاتا ہے۔ کاگا کا نام دھیان میں آتے ہی اس کے ساتھ میرا سلوک بدل گیا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ میرے دماغ میں زاغ و زغن پھنسے ہوئے تھے۔ اس واسطے سے کوّے کے خلاف یہ تعصب تھا۔

پرندوں کی اس سبھا میں ایک غیر جنس بھی شامل ہو گئی۔ ہار سنگھار کی چھاؤں میں چگتے چگتے چڑیوں بلبلوں گڑسلوں نے محسوس کیا کہ بیچ ان کے ایک گلہری بھی آن گھسی ہے جو ان کے کھانے دانے میں حصہ بٹا رہی ہے۔ اس سے اس سبھا میں تھوڑی بدمزگی پیدا ہوئی۔ مگر گلہری نے پرندوں کے ردِ عمل پر دھیان نہیں دیا۔ اسے اپنے کام سے کام تھا۔ پنجوں میں توس کا ریزہ لے کر منہ میں رکھتی جیسے آدمی نوالہ توڑ کر منہ میں رکھتا ہے۔ آخر چڑیوں نے بھی اپنے رویے میں نرمی پیدا کی اور گلہری کے ساتھ افہام و تفہیم کر لی۔

خیر تو میں روز صبح کو ناشتہ کرتے کرتے توس کے کنارے الگ کر کے ریزہ ریزہ کرتا، ہار سنگھار تلے انہیں بکھیر دیتا۔ چڑیاں تو پہلے سے منتظر ہوتیں۔ اِدھر ریزے بکھرے گئے اِدھر وہ مختلف گوشوں سے اُڑ کر آئیں اور چگنے لگیں۔ بلبلیں عین وقت پر آتیں اور ان کی شریک بن جاتیں۔ گڑسلیں بھی ان کے آگے پیچھے آن پہنچتیں۔

ادھر گلہری منڈیر پر دوڑتی ہوئی آتی، تیزی سے نیچے اُترتی اور ناشتے میں شامل ہو جاتی۔ کوا کبھی آتا کبھی نہ آتا۔ جب آتا تو ٹوٹ کر گرتا، انا پ شناپ کھاتا اور فوراً ہی اُڑ جاتا۔

بس یہ وہ وقت ہوتا جب میں محسوس کرتا کہ میں اکٹھا ہو رہا ہوں۔ رنگا رنگ مہمان اُترتے جاتے اور میرے بکھرے ریزے اکٹھے ہوتے جاتے، دیکھتے دیکھتے میں سارا اکٹھا ہو جاتا۔ لگتا کہ اب میں پورا ہوں، بالکل سالم۔

"کس مراق میں بیٹھے ہو۔ آج دفتر جانا نہیں ہے؟" زبیدہ کی آواز۔ اس کے ساتھ ہی جیسے میں پھر بکھرنے لگا ہوں۔

"یاد ہے آج ہاؤسنگ والوں کی قسط بھی جمع کرانی ہے؟"

"وہ بھی یاد ہے۔"

یاد تو تھا۔ مگر ہار سنگھار نے جو پکڑ رکھا تھا۔ چڑیاں تو چگ کر اڑ گئی تھیں۔ مگر ہار سنگھار نے میرا راستہ روک رکھا تھا۔ ان دنوں اس کا موسم تھا۔ گرمیاں جا چکی تھیں۔ اب تو بس دوپہر کی دھوپ میں بچی کھچی چٹکی بھر گرمی رہ گئی تھی۔ مگر وہ تو دوپہر کا قصہ تھا۔ شامیں اور صبحیں تو خنک ہو چکی تھیں۔ اس خنکی کے ساتھ ہار سنگھار کے مہکنے کا موسم شروع ہو گیا۔ شام کے ساتھ پھولنا شروع ہوتا۔ تاریکی میں رات کے ساتھ دمبدم پھولتا چلا جاتا۔ صبح کے دھندلکے میں کتنا ہنستا مہکتا دکھائی دیتا۔ چھاؤں میں اس کی آدھا سفید آدھا زعفرانی بستر بچھا نظر آتا۔ دھیرے دھیرے ایک ایک کر کے پھولوں کا گرنا اور بستر کا دبیز ہوتے چلے جانا

ہار سنگھار کی مہک میں یہ اور کونسی مہک آن شامل ہوئی کہ میں مہکنے لگا۔ اچھا وہ۔ میں یاد کر کے کتنا حیران ہوا۔ میں یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ وہ مہک میری زندگی سے نکل گئی کہیں کھو گئی۔ اے لو وہ تو میرے اندر ہی کہیں گم ہوئی تھی۔ ہار سنگھار کی مہک اسے اندر سے باہر کھینچ لائی۔ پھولوں کے ساتھ یہی تو پریشانی ہے۔ آدمی کو شگفتہ کرنے کے ساتھ ساتھ اداس بھی کرتے ہیں کہ ان کی خوشبو ماضی کی دور دراز گلیوں سے حافظہ کی کسی عقبی کوٹھری سے، کہاں کہاں سے کھوئی ہوئی خوشبوؤں کو کھینچ کر لے آتی ہے۔ مجھے یاد آیا اور میں حیران ہوا کہ اچھا وہ میں تھا، ایک خوشبو نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ پھر بے یقینی کی ایک لہر کہیں سے اُمنڈ آئی نہیں، میں تو یہ ہوں جواب ہوں۔ وہ کوئی اور تھا۔ کتنی دیر میں اس لہر میں بہتا رہا۔ پھر ایک اور خیال آیا کہ اپنے سے ذرا ہٹ کر اس کو دیکھنا تو چاہیئے جو شاید میں ہی تھا اور جیسے میں نہیں کوئی اور تھا۔ اسے دیکھنے کے لئے ذرا اپنا صیغہ ہی تو بدلنا پڑے گا۔ پرانی کہانیوں میں تو آدمی اپنا قالب بدل لیتا تھا۔ تم اپنا صیغہ نہیں بدل سکتے۔ صیغہ واحد متکلم سے صیغہ واحد غائب میں منتقل ہونا، آخر ایسا کونسا لمبا سفر ہے

ان دنوں عجب اس کا عالم تھا۔ اُٹھتے بیٹھتے اسی کا دھیان۔ اس نے اپنی لکھی ہوئی ایک رومانی کہانی اسے پڑھنے کے لئے بھجوائی۔ کہانی پڑھ کر وہ بہت سٹپٹائی۔ فوراً اُسے

فون کیا۔

"اخلاق، تم نے یہ کہانی مجھ پہ لکھی ہے؟" اس کے لہجہ میں تھوڑی برہمی تھی۔

وہ بہت سٹپٹایا۔ "تم پہ؟ نہیں تو۔"

"نہیں کیسے۔ مجھ پہ تو لکھی ہی ہے۔ تم نے میرے بارے میں کیسی کیسی باتیں لکھی ہیں۔"

"تمہارے بارے میں؟ کونسی باتیں ہیں تمہارے بارے میں۔"

"بہت بھولے بن رہے ہو۔ تمہیں پتہ نہیں ہے کہ تم نے میرے بارے میں کیا کیا لکھا ہے۔"

"مگر یہ کہانی تو میں نے اس وقت لکھی تھی جب میں تمہیں جانتا ہی نہیں تھا اور اب بھی ...."

بات کاٹتے ہوئے۔ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

اس پر وہ لاجواب ہو گیا۔

پھر اس نے واقعی اس کے بارے میں ایک کہانی لکھی۔ اسے پڑھنے کو بھجوائی۔ اس نے کہانی پڑھی اور فون کیا۔

"اخلاق، یہ کہانی تم نے کس لڑکی کے بارے میں لکھی ہے۔"

"تمہارے بارے میں۔"

"میرے بارے میں۔ کیوں مذاق کر رہے ہو۔ سچ بتاؤ۔ یہ کون لڑکی ہے۔"

"یہ تم ہو۔"

"میں؟ کسی کو بنانا تو تمہیں خوب آتا ہے۔ سچ سچ بتاؤ یہ ہے کون اور تمہارا اس سے ــــ اچھا خیر یہ میں نہیں پوچھتی۔ بس اتنا بتا دو کہ لڑکی کون ہے۔"

"میں کیسے تمہیں یقین دلاؤں کہ یہ تم ہو۔"

"میں کیسے تمہیں یقین دلاؤں کہ یہ تم ہو۔"

"یہ میں ہوں۔ چہ خوب۔ میں کہاں سے ہو گئی۔ تم نے تو ابھی مجھے دیکھا ہی نہیں ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

اس پر وہ لاجواب ہو گئی۔ ٹیلی فون بند کر دیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد پھر فون کیا۔ بہت بے چین لگ رہی تھی۔ آواز سے پتہ چل رہا تھا کہ کتنی بے چین ہے۔ "اچھا یہ بتاؤ اخلاق میرے بارے میں یہ باتیں تمہیں بتائیں کس نے۔"

"طوطے نے"

"طوطے نے" وہ چکرا گئی۔

"ہاں طوطے نے"

پوچھنا راجہ رتن سین کا ہیرامن طوطے سے اور بیان کرنا ہیرامن طوطے کا رتن سین سے کہ یہاں سے سات سمندر پار ایک نگر ہے سرانديپ۔ راجہ ہے اس کا گندھرپ سین۔ بیٹی ہے اس راجہ کی پدماوت، نازک بدن، گج گامنی، چندر مکھی، بال ساون کی گھٹا جیسے، گردن صراحی ایسی، سینہ ہری بھری کھیتی، پیٹ صندل کی تختی، کمر پتلی، کولہے بھاری اور سن کے عاشق ہو جانا رتن سین کا اور تڑپنا مچھلی کی طرح اسے ایک نظر دیکھنے کے لئے۔

"یعنی کہ تم نے اسے دیکھا ہی نہیں ہے۔"

"نہیں۔"

"تم مجھے چلا تو نہیں رہے ہو۔" ممتاز نے شک بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"صحیح کہہ رہا ہوں۔ ابھی تک نہ ملاقات ہوئی ہے۔ نہ میں نے اسے دیکھا ہے۔"

"یعنی تمہیں پتہ نہیں کہ وہ ہے کیسی۔"

"جب دیکھا ہی نہیں ہے تو کیسے پتہ ہو سکتا ہے کہ وہ کیسی ہے۔"

"اچھا" ممتاز تعجب میں پڑ گیا "اخلاق، جب تم نے اُسے دیکھا ہی نہیں ہے تو تو تمہیں اس سے عشق کیسے ہو گیا؟"

"یہی بات تو میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"بکواس۔ یہ کوئی عشق وشق نہیں ہے۔"

وہ خود شک میں مبتلا تھا۔ ہاں واقعی، جب میں نے اسے دیکھا ہی نہیں ہے اور کسی دیکھنے والے نے بھی کبھی نہیں بتایا کہ وہ کیسی ہے تو پھر مجھے عشق کہاں سے ہو جائے گا۔ شاید یہ بس ایک خلش ہے، ایک یہ جاننے کی آرزو کہ وہ کیسی ہے۔

"خیر عشق تو یہ نہیں ہے۔ مگر میں یہ پوچھتا ہوں کہ جب تم نے اسے دیکھا نہیں، اس سے تمہاری ملاقات نہیں ہوئی تو وہ تمہارے چکر میں یا تم اس کے چکر میں آئے کیسے؟"

"یار، کوئی ایسی بات ہی نہیں تھی۔ میں دفتر اس روز ذرا دیر سے پہنچا۔ دیکھا کہ میری میز پہ ایک نازک سا فاؤنٹین پین رکھا ہے۔ میں نے اپنے چپراسی سے پوچھا، رحمت یہ فاؤنٹین پین کیسا ہے۔ صاب جی ایک بی بی آئی تھی۔ کہنے لگی کہ مجھے ایک ضروری فون کرنا ہے۔ میں اسے یاں پہ لے آیا کہ بی بی یاں سے فون کر لو۔ وہ بی بی ٹیلی فون پہ باتیں کرتے کرتے کچھ لکھ رہی تھی۔ پھر چلی گئی۔ بعد میں میں نے دیکھا کہ وہ اپنا فاؤنٹین پین چھوڑ گئی ہے۔ میں نے رحمت کی بات سن کر پین اپنی دراز میں رکھ لیا کہ آئے گی تو اس کے حوالے کر دوں گا۔ دوسرے دن اس کا فون آگیا کہ جی میں آپ کی میز پہ اپنا پین بھول آئی تھی۔ میں نے کہا کہ محفوظ ہے۔ بولی کل میں بارہ ساڑھے بارہ بجے آکر لے جاؤں گی۔ دوسرے دن ان اوقات میں میں نے اس کا انتظار کیا۔ آئی ہی نہیں نہ خود آئی نہ فون کیا۔ اس کے دوسرے دن فون پر معذرت کی کہ آ نہیں سکی۔ اس پر میں نے ایک فقرہ کہہ دیا۔ بس لائٹ موڈ میں کہا تھا۔"

"کیا فقرہ کہہ دیا۔ وہ بھی بتا دو۔"

"میں نے بس یوں ہی ایک فقرہ لگا دیا کہ دیکھئے آپ کا پین میرے لئے شہزادی کی جوتی تو نہیں بن جائے گا۔ اس پر وہ چکرائی، جی میں سمجھی نہیں۔ میں نے کہا مطلب یہ ہے کہ جس طرح پرانی کہانیوں میں شہزادیاں شادی بیاہ سے واپس ہوتے ہوئے ہبڑ دبڑ میں اپنی ایک جوتی چھوڑ جایا کرتی تھیں اور پھر وہ جوتی بدنصیب شہزادے کے گلے کا ہار بن جاتی تھی۔ اس طرح تو نہیں ہوگا۔ اس پر وہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنسی یار اس کا اس طرح کھلکھلا کر ہنسنا، بس میں تو فنا ہو گیا۔"

"اچھا؟"

"ہاں۔ یار کیا ہنسی تھی اس کی۔"

"پھر ہوا کیا؟"

"اس کے بعد پین کے لئے اس کا آنا تو ملتوی ہوتا چلا گیا۔ معذرت کا فون آجاتا تھا۔ بس اس وقت سے یہ سلسلہ چلا ہوا ہے۔"

اس پر ممتاز جی کھول کر ہنسا "یار اخلاق، تم نے فقرہ غلط کہہ دیا۔"

"کیسے؟"

"تم نے اُسے شہزادی کا STATUS دے دیا۔ اب وہ تمہیں شہزادی بن کر دکھا رہی ہے۔ پیارے بہت ستائے گی۔"

"پھر کیا کیا جائے؟"

"اب تم اس کی اُلٹ بات کہو۔ اب کے فون آئے تو کہو کہ یہ پین شہزادی کی جوتی نہیں ہے کہ میں اسے اپنے گلے کا ہار بنا لوں۔ آپ اسے لینے آ رہی ہیں۔ یا میں اپنی ٹائپسٹ کو پریذنٹ کر دوں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔"

اُس نے کتنا مصمم ارادہ کیا تھا کہ اب کے وہ دو ٹوک لہجہ میں بات کرے گا۔ مگر

جب اس کا فون آیا تو بات کہیں سے چلی اور کہیں پہنچ گئی۔ کتنی باتیں ہوئی تھیں۔ اس روز اور فون پر اس روز آواز کتنی صاف آ رہی تھی۔ جیسے بالکل قریب بیٹھی باتیں کر رہی ہو۔ باتیں کرتے کرتے جب درمیان میں ایک ذرا وقفہ آتا تو اُسے اس کے سانس کی آواز تک سنائی دیتی۔ آواز دھیمی ہوتی گئی۔ وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے کہ وہ اس کے گرم سانس کو اور اس کے بدن کی آنچ کو محسوس کر سکتا تھا۔ فون درمیان سے غائب ہی ہو گیا۔ کتنی دیر تک وہ سر جوڑے باتیں کرتے رہے۔ آہستہ آہستہ کبھی اتنی آہستہ کہ بات سرگوشی بن جاتی۔

جب فون سے فارغ ہو کر وہ باہر نکلا تو دونوں وقت مل رہے تھے۔ ارے یہ تو شام ہو گئی۔ وہ حیران ہوا، اچھا آج اتنی لمبی بات ہوئی تھی۔ کمال ہو گیا۔ چلتے چلتے اس نے حیرت سے آسمان کی طرف دیکھا جہاں اب ستارے نکل آئے تھے۔ آسمان کتنا نیچے آ گیا تھا اور ستاروں سے کتنا بھرا ہوا نظر آ رہا تھا اور آج ستارے بھی کتنے بڑے بڑے نظر آ رہے تھے اور کتنے قریب کہ بس وہ ذرا ہاتھ بڑھائے گا تو مٹھی میں بہت سے ستارے آ جائیں گے۔

"آج کیا دفتر سے چھٹی لے لی ہے۔ مگر قسط تو جمع کرانی ہے یا وہ بھی نہیں کرانی؟"

زبیدہ کی سرزنش بھری آواز اور اس کے ساتھ ہی ستارے غائب، واپس اپنے صیغہ میں۔ وہی صیغہ واحد متکلم کا قید خانہ جہاں سے نہ آسمان نظر آتا ہے۔ نہ ستارے دکھائی پڑتے ہیں۔ ان دنوں میں اندر سے کتنا بھرا بھرا محسوس کرتا تھا، جیسے میرے اندر بہت کچھ ہے، جیسے میں بہت کچھ ہوں۔ خالی میں نہیں، میں سے بڑھ کر بہت کچھ، ستاروں سے بھرے آسمان کی طرح میرے اندر سچ مچ ستارے بھرے ہوئے تھے۔ میں تھا کہ جھلملاتے ستاروں سے لدا پھندا آسمان تھا۔ اور اب، میں نے سوچا، میں اندر سے کتنا خالی ہوں، کتنا تتر بتر ہوں۔ اگر چڑیوں کی یہ سبھا نہ ہوتی اور ہار سنگھار کا

یہ پیڑ نہ ہوتا تو میں تو بالکل ہی گیا تھا۔

زبیدہ سر پہ آن کھڑی ہوتی تھی۔ کس بیزاری کے ساتھ ہار سنگھار اور چڑیوں کی بھری سبھا کو چھوڑ کر وہاں سے اُٹھا۔ بے دلی کے ساتھ کپڑے بدلے اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ باہر نکل کر کتنی رکشا والے کو رام کیا۔ رکشا کی سواری تو ویسے ہی آدمی کو توڑ کر رکھ دیتی ہے اور میں تو پہلے ہی سے ٹوٹا ہوا تھا۔

رکشا والا مال کی طرف دوڑتے دوڑتے پھر پلٹ پڑا۔ واپس ہوتے ہوئے ایک رکشا والے نے اس سے اشارے میں کچھ کہا تھا۔

"کیوں اب کیا ہوا؟"

"آگے رستہ بند ہے۔"

"ادھر سے بھی رستہ بند ہے؟"

"ہاں ادھر سے بھی بند ہے۔" یہ کہتے کہتے اس نے رکشا کا رُخ موڑا اور پھر دوڑنا شروع کر دیا۔

"اب مجھے کہاں لئے جا رہے ہو؟"

"اے جی آفس کی طرف سے رستہ کھلا ہو گا۔ ادھر سے نکالتا ہوں۔"

اے جی آفس کے قریب پہنچ کر رکشا والا پھر ٹھٹک گیا۔ "ادھر سے بھی رستہ بند ہے جی۔ میرے یاروں نے پوری مال ہی کی ناکہ بندی کر رکھی ہے۔"

"یہ تو بڑی مشکل ہے۔" میں بڑبڑایا۔ "مجھے تو بنک میں ضروری کام ہے۔ میں ادھر اسی طرح بھٹکتا رہ جاؤں گا۔ ادھر بنک بند ہو جائے گا۔"

رکشا والے نے اچانک رکشا کو موڑا اور ایک گلی میں داخل ہو گیا۔

"بھئی یہ کہاں لئے جا رہے ہو مجھے"

"جی آپ کو بنک تو پہنچانا ہی ہے۔ یہ راستہ بنک کے قریب جا کے نکلے گا"

اس کے ساتھ ہی رکشا نے اچھلنا شروع کر دیا۔ ہر جھٹکے کے ساتھ ہی اچھل پڑتا۔

"بھائی رکشا والے مجھے تم بنک تو پہنچا دو گے۔ مگر پسلیوں سمیت پہنچاؤ تو اچھا ہو"

"بابو جی اللہ اچھا ہی کرے گا"

یہ رستہ میرے لئے بالکل نیا تھا اور میں حیران ہو رہا تھا کہ میں روز صبح شام مال آتا جاتا ہوں۔ مگر مجھے کبھی احساس ہی نہیں ہوا کہ مال کی طرف اتنے رستے جاتے ہیں۔ کتنے رستے آس پاس کی سڑکوں سے نکلتے ہیں اور مال کی طرف جاتے ہیں۔ مگر کیا فائدہ۔ کوئی ایک واقعہ کوئی ایک اندیشہ دفعتاً ان سارے رستوں کو مسدود کر سکتا ہے۔

گلی سے رکشا کے نکلتے نکلتے میں نے دیکھا کہ سامنے چند قدم کے فاصلے پر مال نظر آ رہی ہے اور اس کے پرلی طرف بنک دکھائی دے رہا ہے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ مگر رکشا والے نے ایک دم سے بریک لگائے "باؤ جی یہ رستہ بھی بند ہے"

"کہاں بند ہے" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"باشاؤ غور سے تو دیکھو۔ سامنے سڑک پہ کانٹے دار تاروں سے رستہ رکا ہوا ہے"

۷

عزیزو باتمیز و اسلاف کا ذکر کہاں تک کروں۔ خاندان کی عظمت کتنا بیان کروں

ع سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

سو ہاتھ کھینچتا ہوں اور رہوار قلم کو موڑ کر عرضہ حال میں لاتا ہوں۔ خاندان کی عظمت و شوکت اب فسانہ ہے اسلاف کا دیدہ طنطنہ قصۂ پارینہ ہے میں خاندان کی گمشدہ عظمتوں کا ماتم دار ہوں، اپنے وجود پر شرمسار ہوں بزرگ اچھے رہے کہ بھلے وقتوں میں گذر گئے۔ خاندان کے زوال کا منظر دیکھنے کے لیے ننگِ اسلاف مشتاق علی رہ گیا۔

واضح ہو کہ فقیر نے آنریری مجسٹریٹی کو سلام کر لیا ہے کچہری میں حاضری دینے والوں کے تیور بدلے ہوئے تھے میرے فیصلوں پر نکتہ چینی کرتے تھے ہر پھر کر وہی ایک اعتراض کہ فیصلہ بربنائے تعصب کیا گیا ہے مسلمان فریق کی پاسداری کی گئی ہے یہ رنگ دیکھ میں نے عافیت اسی میں دیکھی کہ کلکٹر صاحب بہادر سے ضعیفی کا عذر کر کے اس عہدہ جلیلہ سے سبکدوشی حاصل کر لوں بس اب خالی خان بہادری رہ گئی ہے مسلمانانِ شہر ہنوز اس سے مرعوب ہیں سمجھتے ہیں کہ آفت آنے پر میری خان بہادری انہیں بچا لے گی بھلا جب فرنگی کے قدموں تلے کی زمین سرکی ہوئی ہے تو اس کے دیئے ہوئے خطابات کی کیا وقعت رہ گئی۔ مگر میں ان سے صاف صاف کچھ کہتا بھی نہیں۔ اگر ایک بے وقعت خطاب سے ان کی ڈھارس بندھی ہوئی ہے تو بندھی رہنے دو۔ سو دیکھتا ہوں، سنتا ہوں، مگر لب پر کوئی بات نہیں لاتا ہوں میرا حال سوائے میرے خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ ایک

ایک پنڈت گنگادت مجبور تھے ان سے دل کا حال کہہ لیا کرتا تھا اور جی کی بھڑاس نکال لیا کرتا تھا وہ بھی سورگ میں جا براجے۔ ہائے پنڈت کیا ہیرا تھا کہ مٹی میں مل گیا اس کی کہی ایک بات مجھے ان دنوں رہ رہ کے یاد آتی ہے کہنے لگا کہ شری مشتاق علی، تمہیں پتہ ہے کہ انت میں شیر اریہ ورت غازی ارجن کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ پنڈت کیا ہوا تھا۔ مشتاق علی جی، جب حضرت سری کرشن کے وصال کے بعد ارجن مہاراج ان کی ازواج مطہرات کو لیکر دوارکا سے نکلے تو رستے میں بٹ ماروں نے ان پر ہلہ بول دیا مگر وہ کس بل والا اچانک اتنا نربل ہوگیا کہ دھنش کو کھینچتا ہے۔ تو دھنش نہیں کھنچتی۔ جس مرد جرک نے بھارت ورش کے نامی گرامی سادھنوں، سورماؤں سے اپنی طاقت کا لوہا منوایا تھا اسے بٹ ماروں نے پسپا کر دیا۔ اس مرد غیور نے اس کا بہت شوک کیا حضرت ویاس جی کے حضور میں پہنچ کر گریہ کیا اور استفسار کیا کہ رشی مہاراج میرا کس بل کہاں چلا گیا۔ حضرت نے ارشاد فرمایا "میرے پتر، اے فرزند ارجمند یہ سب کال کا چکر ہے۔

یہ سن کر اس گنہگار نے ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا کہ پنڈت تمہارے ویاس جی نے درست فرمایا۔ وقت بیشک زور آور ہے اس کے سامنے آدمی ناطاقت ہے۔ پنڈت سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر افسردہ ہو کر بولا "صحیح کہا۔ بالکل صحیح کہا۔ کال بلوان ہے ہم نربل ہیں"۔ چپ ہوا۔ پھر بولا "مشتاق علی، ہمارا تمہارا سمے بیت گیا اب کشن۔ لال کا زمانہ ہے"۔

میں نے کہا کہ پنڈت کوئی مجھے بتا رہا تھا کہ تمہارا کشن لال جن سنگھیوں کا لیڈر بن گیا ہے"۔

پنڈت نے جواب میں سر نیوڑھا لیا۔ شرمندگی سے بولا "مشتاق علی تم نے صحیح سنا۔ جب ہی تو اس عاصی پر معاصی نے یہ عرض کیا تھا کہ ہمارا سمے بیت گیا اب کشن لال۔ کا زمانہ ہے باپ ڈھے رہا ہے، بیٹا زور پکڑ رہا ہے"۔ پھر بڑبڑانے لگا۔ کلہ

ڈوبا بنس کبیر کا جس اونچیو پوت کمال

پنڈت مہجور واقعی ڈھے رہے تھے پھر ڈھیتے ہی چلے گئے۔ ایک دن بالکل ہی ڈھے گئے۔ ہائے پنڈت، تو کتنا طوطا چشم نکلا۔ دوست کو کیسے آشوب کے ایام میں چھوڑ کر گیا ہے دیکھ یہ ناتواں بھی اب ڈھیتے لگا ہے بس اب گرا کہ اب گرا مگر اس میں تسکین کا پہلو نہیں ہے۔

مہجور سے ملاقات تو مرنے کے بعد بھی نہیں ہوگی۔ ظالم تو نے میرا کہا مان لیا ہوتا اور ایک دفعہ کلمہ پڑھ لیا ہوتا تو حشر میں ملاقات کی توقع ہو سکتی تھی کہ تیرا میرا ایک ہی حشر ہوتا۔ اب کس بہانے یہ توقع کروں۔ آخر لامحالہ گنہگار کو انہیں کے ساتھ اٹھایا جاتا ہے جن میں سے میں ہوں۔ میرا حشر الگ، تیسرا حشر الگ، خیر حشر کی حشر پر دیکھی جائے گی۔ مگر میرا حشر تو اس وقت بھی انہیں کے ساتھ ہوتا نظر آ رہا ہے جن میں سے میں ہوں۔ مہجور تو اگر زندہ بھی رہتا تو کیا اپنے رفیق دیرینہ کو اس حشر سے بچا لیتا۔

وائے ہوائے زمانے تجھ پر کہ تو نے رفاقت کے باغ میں نفاق کا بیج بو دیا۔ اور ہمسائے کو ہمسائے کا دشمن بنا دیا۔ مہجور کا نور نظر کشن لال کل تک مجھے تاؤ کہتا تھا اب مجھے دو پورے سلام کرنے کا روادار نہیں۔ مہجور کے سوگیاشی ہونے کے بعد ایک مرتبہ البتہ میرے پاس آیا تھا مگر سر سے ایک بوجھ اتارنے نہ کہ از راہ سعادت مندی۔ میں تو اسے دیکھ کر تصویر حیرت بن گیا۔ نہ آنکھ میں لحاظ نہ ادا میں پاس ادب۔ ایک پلندا میرے ہاتھ میں پکڑا دیا اور روکھے پھیکے انداز میں کہنے لگا کہ "پتا جی فارسی اکثروں میں جانے کیا لکھتے رہتے تھے میں تو ان کی لکھت پڑھ نہیں سکتا۔ یہ اکثر تاؤ جی آپ ہی لوگوں کے ہیں آپ ہی انہیں سنبھالیں"۔

میں اس جوان عزیز کا منہ تکنے لگا۔ کوئی جواب نہیں دیا۔ مخطوطہ اس سے لے کر رکھ لیا۔ جب چلا گیا تو سوئے آسمان دیکھا مگر قسم پاک پروردگار کی کوئی شکوہ نہیں